"کئی چاند تھے سرِ آسماں": مردانہ کردار

محمد شہباز
مجاہد حسین

ABSTRACT:

"Shamsur Rehman Farooqi's novel "Kai Chand They Sar-e-Aasman" is ranked as one of the seminal works of the first decade of the twenty first century. In this work, Farooqi has in the wake of countours of Indo-Islamic civilization has brought out through some very living and thriving male characters. The researcher has through analytical lens brought out the exquisite way Farooqi has crafted the male characters of his novel."

Key words: Faruqi, Novel, Indo Islamic Civilization, Male Characters, Historical Characters

صدیوں پہلے ارسطو (Aristotle)(۳۸۴ ق م۔۳۲۲ ق م) نے المیہ (Tragdey) ڈرامے کی بحث میں پلاٹ (Plot) کو اوّلیت کا تاج پہنایا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں کرداروں کی اہمیت، پلاٹ سے کسی طور بھی کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فی زمانہ افسانوی ادب میں سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو انسانوں، یعنی کرداروں کا مطالعہ ہی خیال کیا جاتا ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ کرداروں کی اہمیت کے رجحان نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کو ماضی کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ منوایا ہے۔ بلاشبہ اِس خاص میلان کو سب سے پہلے رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء۔۱۹۰۳ء) نے نہ صرف محسوس کیا، بل کہ اِس کا عملی اظہار بھی اپنے ناولوں کے ذریعے قارئینِ ادب کے سامنے پیش کیا۔ نتیجہ معلوم جدید اُردو فکشن میں کرداروں کو واقعات پر فوقیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

ایک مشّاق ناول نگاراِس بات کو بہ خوبی جانتا ہے کہ کسی بھی ناول کی کام یابی کی اصل وجہ بڑی حد تک موثر کردار نگاری، یعنی کرداروں کی درست بنت (Craftsmanship) کی ہی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے، اِس لیے اگر کوئی ناول نویس اِس فن میں مہارتِ تامہ نہیں رکھتا تو وہ ایک کام یاب ناول نگار کہلائے جانے کا مستحق بھی نہیں ٹھہرتا۔ جہاں تک شمس الرحمن فاروقی (پ:۱۹۳۵ء) کے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" کا تعلق ہے تو اِس میں ہر طرح کے کردار موجود ہیں، جو ہماری دنیاے آب و گل کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ چوں کہ اِس ناول کے سبھی کردار اپنے افعال و اعمال میں مکمل طور پر با اختیار ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کہیں بھی مصنف کے اشاروں پر ناچنے والے بے جان پتلے محسوس نہیں ہوتے۔ اِن کرداروں کے جان دار ہونے میں بنیادی رمز یہ ہے کہ مصنف نے اِنھیں کُلّی طور پر آزادانہ اور فطری ماحول میں تخلیق کیا ہے، گویااِن کے اختیارات اور مجبوریاں، اِن کی بشری خوبیاں اور خامیاں اور اِن کا فطری چال چلن اِنھیں حقیقی زندگی کے کرداروں ایسی صورت عطا کرتا ہے۔ اِس امر کا بین ثبوت یہ ہے کہ اِن کرداروں کے ارتقائی مراحل بہ تدریج اورانتہائی فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔ حالات و واقعات کے مطابق اِن کے مزاج اور برتاؤ میں تغیر بھی رونما ہوتا ہے، جس کی وجہ سے قاری کو اِن کرداروں سے نامانوسیت اور مغائرت محسوس ہونے کے بجائے اِن سے قربت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بلاشبہ اِس ناول کے بیشتر کردار قاری کے دوست ہیں، جنھیں وہ ہر حالت میں اپنے دل سے قریب رکھتا ہے۔ اِن کی خوشی کو اپنی خوشی اور غم کو اپنا غم محسوس کرتا ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں اِس ناول کے کرداروں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیگر خصائص کے ساتھ ساتھ اِس ناول کا آغاز بھی ایک طرح سے ندرت و جدت کا حامل ہے، کیوں کہ مصنف نے ایک غائب اور گھڑے ہوئے کردار (Self Created Character) ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کی یادداشتوں کا سہارا لے کر اِس ناول کا آغاز کیا ہے، تاہم فاروقی کا اندازِ بیان اِس قدر جان دار اور پُر اثر ہے کہ ناول کا بیشتر حصہ سنجیدہ و متین ہونے کے باوجود بناوٹی یا پُر تصنّع محسوس نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کا فرضی کردار ایک راوی کی حیثیت سے اِس ناول میں داخل ہوتا ہے۔ طب کا پیشہ تیاگنے کے بعد ڈاکٹر موصوف علم الانساب، یعنی شجرے بنانا یا بنے ہوئے شجروں میں توسیع کرنے کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے۔ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کا یہ خیالی کردار فی الاصل مصنف کی اپنی ذات کی نمائندگی کرتا ہے، جو نہ صرف قاری سے ہم کلام ہو کر مصنف کے

نقطۂ نظر اور فلسفۂ حیات کو قاری پر منکشف کرنے کا وسیلہ بنتا ہے، بل کہ مصنف نے اِس خود ساختہ کردار کے توسط سے سلسلۂ فاروقی کی شجرہ کشائی کا کام بھی لیا ہے۔

ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کا یہ کردار عملی طور پر ناول کے تیسرے باب "وسیم جعفر" میں ہمارے سامنے آتا ہے، جو صیغہ واحد متکلم، یعنی بیانیہ انداز میں کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہ کردار کہانی کی تفہیم اور ناول کے ارتقائی مراحل میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اِس کردار کے ذریعے ناول کی کہانی میں تسلسل اور وضاحت و تصریح کے عناصر جنم لیتے ہیں۔ قیافہ شناسی کے اوصاف بھی اِس کردار میں پائے جاتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ مخطوطہ شناسی کے بارے میں بھی ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کا علم خاصا وسیع دکھائی دیتا ہے، تاہم کتاب ملنے کے بعد اِس کردار کی شخصیت میں پُراسراریت کے عناصر در آنے کی وجہ سے ناول میں کسی قدر ربوریت کا احساس ہونے لگتا ہے، لیکن مجموعی سطح پر ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کا کردار ایک احتیاط پسند اور پُرخلوص شخص کا کردار ہے، جس کی گفتگو میں عجز و انکسار اور علم و ادب کی بو باس بہ خوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔

میاں مخصوص اللہ المعروف بابا میاں یا میاں چیتر اکشن گڈھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ہندل پروا کا ایک مایہ ناز شبیہ ساز تھا۔ واضح رہے کہ ہندل پروا کے لوگوں کی اکثریت تصویر سازی، رنگ سازی اور کاغذ سازی کے فن میں یکتائے روزگار تھی۔ میاں مرقع نگار انتہائی پُراسرار اور معمول سے ہٹی ہوئی فطرت کے ساتھ زندگی کرنے کا عادی تھا۔ اِس گاؤں میں مسلمانوں کے صرف تین گھر تھے۔ مصنف کے خیال میں وہ شاید ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے بچے کے کان میں اذان بھی دیتا ہے اور کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ گو کہ وہ نماز روزے کا کوئی خاص پابند نہ تھا، مگر کبھی کبھی وہ مسجد میں عبادت کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور شاید وہ مسلمان بھی نہیں تھا:

> "میاں مخصوص اللہ کا اصل نام مجھے نہیں معلوم۔ نہ اِس وقت اُن کی عمر کا ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب ہندل پروا کا بھی نشان صفحہ ہستی پر نہیں کہ وہاں کسی سے پوچھ لیا جائے۔ بس اتنا ہی ہے، جو میں گوش گذار پیارے ناظرین اپنے کے کر ہی چکا کہ اغلب ہے غیر مسلم تھے اور اُن کا آبائی نام کچھ اور تھا۔ اِس وقت اُن کی عمر کوئی تیس پینتیس رہی ہو گی، لیکن دنیا سے بہت الگ تھلگ رہنے اور اپنے کھانے لباس کی کچھ فکر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتے تھے اور سارا گاؤں اُنھیں "میاں" یا "بابا" کہتا تھا۔" (۱)

کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اُسے کوئی غیبی طاقت کنٹرول کرتی تھی، بل کہ بنی ٹھنی سے اُس کی وارفتگی اور اُس کی موت بھی ایک پہیلی سے کم نہیں۔ وہ بنی ٹھنی کا خالق تھا یا دیوانہ، قیدی تھا یا کچھ اور، اُسے من موہنی سے محبت تھی کہ نہیں، یا اِس کا اُس سے کوئی تعلق بھی تھا کہ نہیں، یہ محبت خیالی تھی کہ حقیقی، یہ سب ایک معمّا ہے، لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ اِس کے ہاتھوں میں تصویر بنانے کا فن کمال کی حدوں کو چھوتا تھا:

> "جاننے والے جانتے تھے کہ اُس کے ہاتھوں میں قوسِ قزح اور انگیوں میں صبح اور چاندنی کی روشنیاں اور بادلوں اور دھندلکوں کی سیاہیاں ہیں۔ چنار کا ایک خشک پتا، ایک پیالی پانی اور ایک دومٹ میلے رنگ میاں کو مل جائیں تو وہ پورے پیڑ کو نہ سہی، اُس خشک پتے کو پھر سے زندہ کر سکتا تھا۔" (۲)

میاں چیترے کا کردار عمومی طور پر تو ایک خاموش طبع انسان کا کردار ہے، مگر اپنی بیوی سے گفتگو کرتے ہوئے کبھی کبھی وہ غصے کا اظہار بھی کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ بچوں کے ساتھ تھوڑا بہت بے تکلف ہو لیتا تھا، مگر اُس کے کردار کی نمایاں خوبی کم گوئی یا خاموش طبعی ہی تھی۔ مصنف کے یہ قول: "وہ دن بھر میں شاید دس یا بیس کلمے ادا کرتے ہوں، ورنہ بالکل چپ ہی رہتے۔"(۳) بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ میاں چیترے کا کردار اِس قدر مضبوط ہے کہ اُس کی غلطی (اگر وہ غلطی تھی بھی تو) کی سزا پورے ہندلولی گاؤں کے لوگوں کو ملتی ہے، مگر وہ میاں چیترے کی خاطر ماتھے پر بل لائے بغیر اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں سے نکل جاتے ہیں اور راستے میں ہر طرح سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں، جس سے لوگوں کے دل میں اُس کے لیے پائی جانے والی عزت و تکریم کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "لہٰذا قافلے کے ہر فرد نے اپنی حیثیت کے مطابق اُس کی تقدیم کی اور دشمنوں سے، جانوروں سے، صعوباتِ سفر سے، راہوں کے ہوش ربا پیچ و خم سے اُسے حتیٰ الامکان محفوظ رکھا۔"(۴)

کئی لوگ تو راستے میں ہی مختلف مقامات پر اپنا ٹھکانہ کر گئے، بہت کم ایسے بچے جو پانچ ماہ کی مسافت کے بعد بارہ مولہ پہنچے۔ بارہ مولہ پہنچ کر میاں چیترے نے فنِ مصوّری کو خیر باد کہہ کر لکڑی پر نقش و نگار بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اِس کام میں بھی اُس نے ایسی مہارت دکھائی کہ وہ کشمیر کا اوّل درجے کا نقاش کہلایا جانے لگا۔ میاں کو نئی نئی اختراعیں کرنے کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ وہ بار بار اپنے پیشے بدلتا ہے۔ وہ ہر مشکل سے مشکل چیز کو سمجھنے کی بہ خوبی صلاحیت رکھتا تھا۔ آٹھ سال کی مدت میں جان توڑ محنت کے بعد اُس نے قالین بافی کے فن میں ایسی دست گاہ حاصل

کی کہ اُس کے فن کے نمونے ہندوستان سے نکل کر ایران و کاشان تک مشہور ہو گئے۔ کشن گڈھ میں تو وہ تن تنہا زندگی کیا کرتا تھا، مگر یہاں آ کر بڑ گام کی ایک لڑکی سلیمہ سے اُس نے شادی کر لی اور وہیں رہنے لگا، مگر اچنبھے کی بات یہ ہے کہ میاں نے بڑ گام میں آ کر بنی ٹھنی کو فراموش کرنے کے بجائے ہاتھی دانت پر یہاں بھی اُس کی ایک تصویر بنا ڈالی۔ بنی ٹھنی کے بارے اُس نے لوگوں کو نہ کبھی کچھ بتایا اور نہ ہی کسی کو ہمت پڑی کہ وہ اُس سے کچھ دریافت کریں۔ یوں بنی ٹھنی کی تصویر کا راز میاں چیترا کے سینے میں ہمیشہ سر بستہ ہی رہا، اور اِس راز کو اپنے دل چھپائے وہ اِس دنیا سے رُخصت ہو گیا۔

میاں کا کردار کئی مواقع پر از حد پُر اسرار نوعیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ میاں کے چہرے پر ہمہ وقت وحشت آمیز استغراق چھایا رہتا تھا ۔ شمس الرحمن فاروقی نے میاں کو مشکل ترین حالات اور خطرات میں دھکیل کر انتہائی صفائی کے ساتھ بغیر کوئی گزند پہنچائے مکھن سے بال کی طرح بہ حفاظت صاف نکال بھی لیا ہے، دوسرے یہ کہ کتنا ہی مشکل مرحلہ یا خطرہ کیوں نہ ہو، میاں اُس سے ہمیشہ محفوظ رہا اور خطرہ اپنی موت آپ مر گیا۔ مختصر یہ کہ میاں چیترے کا کردار توکّل اللہ کا حامل، اپنی دھن کا پکا، مگر مختلف فنون سے آراستہ جادوئی کمالات رکھنے والے فن کار کا کردار ہے، جسے اگر اِس ناول سے خارج کر دیا جائے تو بلا مبالغہ یہ ناول بے رس ہو جائے گا۔

میاں مخصوص اللہ اور سلیمہ کا بیٹا محمد یحییٰ بڑ گامی، جو اپنے باپ کی طرح تعلیم نویسی کا ماہر تھا۔ اُس کے چہرے پر ہمہ وقت ایک عجیب طرح کا قلبی سکون اور تمانیت کھیلتی رہتی تھی۔ سلیمہ نے اُسے عربی، فارسی، ریاضی اور اُردو میں تعلیم دلوائی، اور بعد ازاں اُس کی شادی بشیر النسا نامی ایک پاک سیرت خاتون سے کر دی، جس کے بطن سے دو جڑواں لڑکے داؤد اور یعقوب پیدا ہوئے، جنھیں گانا بجانے کا حد سے سوا شوق تھا۔ اِس بات کا محمد یحییٰ بڑ گامی کو بہت دُکھ تھا کہ اُس کے بچے علم و فن سیکھنے کے بجائے ڈوم اور میراثیوں کی طرح در بدر گاتے پھرتے ہیں۔ محمد یحییٰ بڑ گامی نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار ہجرت کی اور ۳۰ جون ۱۷۹۲ء میں کشمیری صنعتوں کی ایک منڈی میں شرکت کے لیے لاہور گیا۔ جہاں اُس کے فن کی بہت قدر افزائی ہوئی، مگر اُس کا دل کشمیر میں ہی کہیں اٹکا ہوا تھا کہ کب وہ اپنے وطن واپس پہنچے۔ محمد یحییٰ بڑ گامی خوش عقیدہ اور مذہبی عقیدت و احترام سے سرشار ایک ایسا شخص تھا، جس کے ظاہر و باطن سے ہمہ وقت سکون و اطمینان کی شعاعیں پھوٹتی رہتی تھیں، مگر بنی ٹھنی کی تصویر دیکھنے کے بعد اُس کے رگ و پے میں ایک طرح کی وارفتگی و بے چینی سی سرایت کر گئی، جو بالآخر اُس کی

موت پر منتج ہوئی۔ بنی ٹھنی کی تصویر سے ماضی کی موروثی وابستگی اُسے اِس قدر بے کل کر دیتی ہے کہ وہ ایک انجان سی کیفیت میں مبتلا ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔

اِسی طرح داؤد بڈ گامی اور یعقوب بڈ گامی دونوں محمد یحیٰ بڈ گامی کے سیلانی اور لاابالی مزاج کے حامل جڑواں فرزند، جو فارسی شعرا کے دل دادہ اور عمدہ گانے میں طاق ہونے کی وجہ سے اِرد گرد کے علاقوں میں بے حد مشہور تھے، تاہم بعد ازاں موسیقی سے تائب ہو کر وہ دونوں ریشم، زعفران اور شہد کی تجارت شروع کر دیتے ہیں۔ اِس کے بعد تجارت کے پیشے کو بھی خیر باد کہہ کر اُنھوں نے سادہ کاری کے فن میں ایسی مہارتِ تامہ حاصل کی ،جو فرخ آباد کے علاقے میں اُن کی ایک منفرد پہچان بن گئی۔ بعد ازاں دونوں نے کپڑے پر سادہ کاری کا کام شروع کیا اور اِس فن میں بھی اُنھوں نے خوب دام اور نام کمایا۔ اِن دونوں بھائیوں کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ دونوں عادات و مشاغل اور رویوں میں ایک ایسے تھے۔ دونوں میں محبت و موانست کا رشتہ تاحیات قائم رہا، گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے:

> "اکثر ایسا ہوتا کہ ایک بھائی جو بات کہنا چاہتا وہی بات دوسرے کی زبان پر معاً آ جاتی، یا ایک بھائی کہیں جانے کا ارادہ کرتا تو دوسرا اُسی جگہ کی تعریفیں شروع کر دیتا۔ ایک کو کسی شخص یا شے سے وحشت یا بے دماغی ہوتی تو دوسرا بھی اُس شخص یا شے کے بارے میں لازماً یہی محسوس کرتا۔ گانے میں اُن کی جگل بندی اِسی لئے اکثر دو کے بجائے ایک مغنی کا تاثر پیش کرنے لگتی تھی اور ظاہر ہے کہ اِس صفت میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔" (۵)

اگر اِن دونوں کرداروں کی شخصی صلاحیتوں کو پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں پختہ فکری کی شدید کمی تھی۔ اِن کے رویوں سے لااُبالی پن اور بے مقصد سی زندگی کا تاثر بھی ملتا ہے۔ غیر اہم کو اہم جان لینا اِن کی شخصیت کا ایک حیران کن پہلو تھا۔ چھوٹی سی بات کے لیے وہ دونوں اپنے بزرگوں اور ماں باپ کی جائیداد اور بیش قیمت اشیا کو اونے پونے داموں بیچ کر اور باقی ماندہ اپنے اعزہ و اقارب میں تقسیم کر کے نامعلوم منزل کی جانب چل نکلتے ہیں۔ یہ بھی اِن کے کردار کی ایک بڑی بوالعجبی معلوم ہوتی ہے کہ اِنھیں زندگی گزارنے کے اصولوں سے صریحاً کوئی واقفیت نہیں تھی۔ پھر معاً موسیقی سے تائب ہو جانا، یعنی اپنے اُس شوق کو ترک کر دینا، جس کے لیے اُنھوں نے اپنے ماں باپ کی ناراضی تک مول لے لی تھی، یہ سب کچھ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں کرداروں کی ایک کجی یہ بھی ہے کہ وہ دونوں فوراً کسی نقصان کی پروا کیے بغیر حتمی فیصلہ کر لیتے ہیں، یعنی پہلے کشمیر چھوڑنے

اور پھر لڑکیوں کے حسن سے متاثر ہو کر اُن کے گاؤں میں قیام کرنے کا۔ یہ دونوں فیصلے اُن کی غیر ذمہ دارانہ سوچ کے غماز ہیں، گویا اِن دونوں کرداروں کی زندگی کسی خاص مقصد سے کُلیتاً تہی دکھائی دیتی ہے۔ اِن دونوں کرداروں کے اِسی کم زور طرزِ عمل کی وجہ سے اِنھیں مجہول کردار قرار دیا جا سکتا ہے۔

بزرگ قالین باف زیرِ مطالعہ ناول کا ایک اور اہم کردار ہے۔ قالین بافی کی تعلیم دینے والے بزرگ سے میاں چیترا کی ملاقات ایک مسجد میں ہوتی ہے، جو میاں کو ایک کارخانہ نما حویلی میں لے جا کر تعلیم نویسی کی جانب راغب کرتا ہے۔ قالین بافی کی تعلیم دینے والا یہ بزرگ انتہائی بارعب شخصیت کا مالک تھا، جو قالین بافی میں ماہرِ فن کی حیثیت رکھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تمام لوگ نہ صرف دل سے اُس کی عزت کرتے تھے، بل کہ سب اُس کا ہر حکم بھی بسر و چشم بجالاتے تھے۔ بعض مواقع پر اُس کا انداز کسی قدر تحکمانہ یا جارحانہ بھی ہو جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ قالین باف بزرگ کا کردار ایک، باعلم، بہترین داستان گو، جوشِ بیان کے حامل خطیب اور اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے ایک ایسے بزرگ کا کردار ہے، جو قالین بافی کے فن میں اُستادِ کامل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِسی طرح قالین باف بزرگ کا ایک نوجوان شاگرد، جو بزرگ قالین باف کو تعلیم کا نقشہ واپس کرتے ہوئے اپنی کم مائیگی اور شکست خوردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> "اُستاد یہ نقشہ مجھ سے تو نہیں بننے کا۔" اُس نے ایک لمبا سا کاغذ پیش کیا، وہی بادامی رنگ، وہی شنجرفی بے معنی سے نقوش۔" میرے بس میں نہیں ہے اتنے دھاگوں اور اتنے رنگوں کو پڑھنا۔ کوئی پڑھ کر بولتا جائے تو۔۔۔" (۶)

مختصر سی مدت کے لیے ظاہر ہونے والا یہ عارضی کردار ایک کم ہمت، سہل پسند اور پسپا ذہن کا حامل کردار دکھائی دیتا ہے، جس میں حالات سے نبرد آزما ہونے کی معمولی سی سکت بھی دکھائی نہیں دیتی۔

ازاں بعد اِس ناول میں سری نگر کے ایک صاحبِ ثروت تاجر حبیب اللہ بٹ کا کردار آتا ہے، جس کے ہاں موسیقی کی ایک محفل بپا ہوتی ہے۔ اُس محفل میں وہ محمد یحییٰ بڈ گامی اور اُس کے دونوں صاحبزادوں داؤد اور یعقوب کو بھی مدعو کرتا ہے۔ اِس ملاقات میں وہ محمد یحییٰ بڈ گامی کو اخروٹ کی لکڑی کے منقّش ڈبے میں زعفران کی پڑیاں اور دو اشرفیاں بہ طورِ تحفہ پیش کرتا ہے۔ مجموعی طور پر حبیب اللہ بٹ کا کردار ملنساری، خوش گفتاری، مہمان نوازی اور فراخ دلی ایسی جملہ صفات سے آراستہ ایک ایسا کردار ہے، جو سر تا پا محبت و خلوص کی چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بعینہٖ جودھ پوری گر گابی، جس کا تعلق راجپوتانہ کشن گڑی سے تھا، اُس کی ملاقات محمد یحییٰ بڈ گامی سے لاہور کے میلے

میں محرم کی ایک مجلس میں ہوئی۔ یہ نوجوان محمد یحییٰ بڈگامی کو مولانا تقی الدین حیدر رکنابادی کے حکم سے محرم کی مجلس میں شرکت اور تبرک کا حصہ وصول کرنے کے لیے روکتا ہے۔ اِسی مختصر سی ملاقات میں وہ محمد یحییٰ بڈگامی کو اپنے وطن کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نوجوان اپنے گردو پیش کی دنیا سے اچھی خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ اُس کے اندازِ گفتگو سے ادب و آداب اور لہجے میں پُر اعتمادی کے رنگ واضح طور پر جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

گردھر ناتھ جو پیشے کے اعتبار سے ایک مصوّر تھا، محمد یحییٰ بڈگامی کو وہ لاہور کے میلے میں بنی ٹھنی کی تصویر بڑے خلوص و مروّت کے ساتھ بہ طورِ تحفہ پیش کرتا ہے۔ جواباً محمد یحییٰ بڈگامی بھی اُسے ایک قیمتی قالین کا تحفہ عنایت کرتا ہے۔ محمد یحییٰ بڈگامی سے اُس کی مختصر سی ملاقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان شناسی، ملنساری اور اپنائیت کی خوشبو میں رچا ہوا نوجوان ہے۔ اِسی طرح تقی الدین حیدر رکنابادی اجمیر شریف کی سرزمین سے تعلق رکھنے والا ایک انتہائی نیک سیرت اور مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے بزرگ کا کردار ہے، جو مجلسِ عزا میں محمد یحییٰ بڈگامی کو مستغرق دیکھ کر اُس کے پاس آتا ہے اور تبرک کا حصہ دیتے ہوئے محمد یحییٰ بڈگامی سے مختصر، مگر کیف و سرور اور خلوص و مروت پر مبنی گفتگو کرتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج، شستہ و شگفتہ لہجے اور شیریں بیانی کے اوصاف سے سرتاپا مزین تھا۔

زیرِ مطالعہ ناول کا ایک اور اہم کردار محمد یوسف سادہ کار، جس کا اصل وطن تو کشمیر تھا، مگر اُس کے آباؤاجداد کسی زمانے میں کشمیر کو خیر باد کہہ کر دلی میں آباد ہو گئے تھے۔ محمد یوسف سادہ کار کے والد کا نام داؤد، جب کہ والدہ کا نام حبیبہ تھا۔ اُس کی شادی اُس کی پرورش و پرداخت کرنے والی ایک ڈیرے دارنی اکبری بائی کی بیٹی اصغری سے ہوئی، جس کے بطن سے بالترتیب تین بیٹیاں انوری خانم، عمدہ خانم اور وزیر خانم پیدا (۱۸۱۱ء-۱۸۷۹ء) ہوئیں۔ محمد یوسف کا کردار پانچویں باب ''تصویر'' سے اپنی کہانی خود بیان کرتا ہے۔ محمد یوسف ایک ڈرپوک، بزدل، مایوس، غیر فعّال اور جلد ہار مان جانے والے شخص کا کردار ہے، جو سعی و کوشش سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مہرولی شریف خواجہ قطب صاحب کی درگاہِ فلک بارگاہ سے واپسی پر حوض شمسی کے کھنڈرات میں جب اُس کی بہلی کا پہیہ ٹوٹ گیا تو وہ کوئی تدبیر کرنے کے بجائے یک لخت مایوس ہو جاتا ہے:

''وزیر خانم کے باپ نے تو تقدیر ٹھونک لی تھی کہ آج کی رات اُس کے اور اُس کی بیٹی کے لئے
آخری رات ہو گی۔ اب کوئی اِکا دُکا پچھڑا ہوا مسافر تو کیا، کوئی قافلہ بھی گزرنے والا نہ تھا، نہ

کہیں سے کوئی دستگیر پیدا ہو سکتا تھا کہ سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں بند تھے۔ شکستہ بہلی کے سواروں کی رات اِسی بیابان میں گزرنی تھی اور صبح کا منھ دیکھنا اُنھیں شاید ہی نصیب ہوتا تھا۔ لڑکی کو تو لونڈی یا قحبہ بننا تھا اور باپ کی قبر وہیں بننی تھی۔ گاڑی بان شاید بچ نکلتا تو بچ نکلتا۔"(۷)

محمد یوسف کے کردار کی ایک کم زوری یہ بھی ہے کہ وہ عمل سے ہمیشہ دُور رہا۔ اِس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ایک فرنگی (مارسٹن بلیک) اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے گھر میں آ کر اُس کی بیٹی سے رسم و راہ بڑھاتا ہے، مگر وہ خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اُس کی بیٹی کو بغیر نکاح کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے ، مگر اُس کے بدن میں ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کی جانب سے کوئی شرط یا رکاوٹ پیدا کرنے کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ بادی النظر میں تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے وہ کسی داشتہ یا پیشہ ور طوائف کا باپ ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کی اندھی طاقت کا خوف اُس کی غیرت و ناموس کو سلانے کے لیے کافی تھا۔ اِس معاملے میں اُس کا رویہ مٹی کے بے جان پتلے سے زیادہ دکھائی نہیں دیتا اور یہی بات اُس کے کردار کو قاری کی نظروں میں گرا دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں وہ اپنی بیٹی سے دُور رہ کر خفگی کا اظہار کرتا ہے، تاہم اُس کی یہ ناراضی بھی وقت کے ساتھ ساتھ رفع ہو جاتی ہے۔

محمد یوسف سادہ کار کے کردار کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھا تو ایک شریف النفس کشمیری خاندان کا چشم و چراغ، مگر گردشِ حالات کی وجہ سے اُس کی پرورش اکبری بائی نامی ایک طوائف کی آغوش میں ہوئی۔ وہ رنڈی خانے کے اِسی مخصوص ماحول میں پل کر جوان ہوا، پھر اِسی ماحول کی پروردہ اکبری بائی کی بیٹی اصغری بائی سے اُس کی شادی ہوئی۔ ایک طرف محمد یوسف کا نیک طینت خون اور دوسری جانب حسن و جسم کی خرید و فروخت کے ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے اُس کے ظاہر و باطن میں ایک ایسی سرد جنگ جاری رہی، جس کے آگے محمد یوسف ہتھیار تو نہیں ڈالتا، مگر ایک برائے نام مجاہد کی طرح محض برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ خیر اور شر کے باہمی تصادم کا یہ عفریت اُس کی موت تک اُس کا پیچھا کرتا ہے، مگر محمد یوسف نہ اپنے اِرد گرد پھیلے ہوئے شر کو مار سکا اور نہ اپنے خون میں شامل خیر کو صحیح معنوں میں زندہ کر سکا:

"اِس واقعے کے بعد مارسٹن بلیک کسی نہ کسی تقریب سے ہر دو تین دن وزیر خانم کے گھر پہنچ کر سیر و تفریح کی باتیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ اُسے چاندنی چوک اور نہر کی سیر کے لئے لوا لے

جاتا۔ماں تو تھی نہیں، باپ اُن کے ساتھ ہوتا، لیکن طوعاً و کرہاً، اور بیٹی کو پوری چادر لپیٹ کر باہر جانے پر ہمیشہ اصرار کرتا۔" (۸)

بنیادی سطح پر محمد یوسف سادہ کار کا کردار ایک ایسے مجبوراور بے بس شخص کا کردار ہے، جو حالات و واقعات کی سنگینی کے سامنے سینہ سپر ہونے کے بجائے مجبوری ولاچاری کی چادراوڑھ کر زندگی کے اہم ترین مواقع پر بھی غیر فعاّل اور چشم پوشی کا رویہ اختیار کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے ۔اِس کی اساسی وجہ فرنگی سامراج (Imperialism)کا وہ جبر ہے، جس کے آگے ہندوستانی باشندوں کی اکثریت احتجاج کا یارانہ رکھتی تھی۔جب کہ وزیر خانم اور محمد یوسف سادہ کار کی بہلی چلانے والا گاڑی بان ناول کے آغاز میں صرف چند ثانیوں کے لیے ہمارے سامنے آتا ہے، مگر ایک دیرپا تاثر چھوڑ کر ناول کے پردے سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔اِس کردار کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اُس میں ایک معمولی گاڑی بان ہونے کے باوجود دلیری اور بہادری کا وصف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔جب وزیر خانم کی بہلی کا پہیہ حوض شمسی کے کھنڈرات میں ٹوٹ گیا اور مسٹر ایڈورڈ مارسٹن بلیک(Mr. Edward Marston Blake) گشت کرتے ہوئے وہاں آنکلاتو اِس موقع پر محمد یوسف سادہ کار تو موت کا انتظار کرنے لگا، مگر یہ گاڑی بان مارسٹن بلیک کے سپاہیوں سے نہ صرف بہادری کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے، بل کہ اُنھیں احساس دلاتا ہے کہ ہمارے ساتھ زنانہ سواریاں ہیں، اِس لیے آپ لوگ ہماری بہلی سے ذرا دُور ہی رہیں تو بہتر ہو گا:

"حاضر ہیں سرکار، بس زنانہ ایک تل اوٹ ہو جائے، بے پردگی ہوتی ہے۔اِس فروتنی کے عالم میں بھی گاڑی بان کا اشارہ تھا کہ فرنگی مرد ذرا دُور ہی رہے تو بہتر ہے۔" (۹)

یہ ہمت اور جرات وزیر خانم کے باپ میں ہونی چاہیے تھی، جو اِس گاڑی بان کے ہاں پائی جاتی ہے۔مزید یہ کہ اِس کے رویے سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ اپنی سواریوں کی عزت اور جان و مال کو بھی اپنی ذمہ داری خیال کرتا ہے۔اِسی طرح جب ہوا کے زور سے وزیر خانم کی چادر اُڑ جاتی ہے تو یہی گاڑی بان فوراً چادر کھینچ کر وزیر خانم کا بدن ڈھانپ دیتا ہے۔گاڑی بان کا اپنی سواریوں کے ساتھ پُر خلوص برتاؤ اِس کا مقام و مرتبہ ہماری نظروں میں اور بڑھا دیتا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ یہ بڑا جان دار اور فطری کردار ہے۔

وزیر خانم کی بہلی کا پہیہ حوض شمسی کے کھنڈرات کے پاس ٹوٹنے کے بعد جب وہ اپنے باپ کے ساتھ بے یارومددگار کھڑی تھی تو مارسٹن بلیک کا وہاں سے گزر ہوا۔مارسٹن بلیک کے ساتھ ایک گھوڑ سوار اور ایک سانڈنی سوار بھی تھا۔مارسٹن بلیک کا یہ سانڈنی سوار جو دھندلی فضا اور شدید اندھیرے کے باوجود اپنی فہم و فراست کو کام

میں لاتے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ کوئی ٹھگ نہیں، بل کہ مصیبت زدہ مسافر ہیں، اِسی لیے وہ گاڑی بان سے تحکمانہ انداز میں ہم کلام ہو کر تمام قصّہ دریافت کرتا ہے اور بعد میں اُسی کی سانڈنی پر سوار ہو کر وزیر خانم اپنے گھر پہنچی ۔سانڈنی سوار ایک پُراعتماد، دُور اندیش اور مردم شناس شخص کا کردار ہے، جو جملہ انسانی صفات سے پوری طرح متصف ہے۔ سانڈنی سوار کے علاوہ مارسٹن بلیک کے قافلے میں منہ ڈھانکے ہوئے دو برچھیت اور دو احدی بھی تھے، جو اپنے مالک (مارسٹن بلیک) کی خدمت میں پوری جانفشانی اور مستعدی کے ساتھ پیش پیش تھے۔ مذکورہ چاروں کرداروں کو روایتی یامثالی کرداروں کی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔

اِس ناول کا ایک اور اہم کردار نواب شمس الدین احمد خان(۱۸۰۹ء۔۱۸۳۵ء)، جس کی اِس ناول میں پہلی آمد (First Entry)ہی دراصل اُس کی بارعب شخصیت کا وقار اور تمکنت قاری کے دل و دماغ پر ثبت کر دیتی ہے۔جب نواب شمس الدین احمد خان ولیم فریزر کے ہاں ایک تقریب میں شریک ہونے کے لیے پہنچاتوزیادہ تر حاضرین نے اُس کا کھڑے ہو کر استقبال کیااور جو ایستادہ نہیں ہوئے اُنھوں نے بھی گرم جوشی کے ساتھ اُسے خوش آمدید کہا۔ نواب شمس الدین احمد خان کے چہرے پر ایک خاص نوع کی آسودگی وخوش حالی کا نشہ اور تجربہ کاری کی پختہ علامتیں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھیں، تاہم اُس کے مزاج میں ایک خاص طرح کی رعونت بھی ہمہ وقت چھلکتی رہتی تھی:

> "شمس الدین احمد کی عمر اُس وقت اکیس بائیس سے زیادہ نہ تھی، لیکن اُن کے چہرے پر امارت کی رعونت اور تجربے کی پختگی کے آثار نمایاں تھے۔" (۱۰)

نواب شمس الدین احمد خان کے والد کا نام نواب احمد بخش خان(۱۷۶۵ء۔۱۸۲۷ء)، جب کہ والدہ کا نام مدی تھا، جو بااعتبارِ مذہب شاید ہندو تھی۔ مدی مہاراؤ راجابختاور سنگھ کی محبوب و معشوق موسی کی بہن تھی، جسے مہاراؤ راجابختاور سنگھ (ف:۱۸۸۲ء) نے نواب احمد بخش خان کو تحفے میں دیا تھا۔ مدی کے بطن سے نواب شمس الدین احمد خان، نواب ابراہیم علی خان اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ نواب احمد بخش خان نے نواب شمس الدین احمد خان کی پیدائش کے بعد مدی سے نکاح کیااور دوسری شادی مغل خاندان کی ایک لڑکی حسینہ بیگم جان سے کر لی، جس سے امین الدین احمد خان اور نواب ضیا الدین احمد خان اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ نواب شمس الدین احمد خان کی تیزی اور مزاج کی گرمی کا نواب احمد بخش خان کو احساس تھا کہ میرے بعد وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔اِسی لیے نواب احمد بخش خان نے اپنی وصیت میں تمام بیٹوں کو اُن کے حصے کی جائیداد تقسیم کر دی، تاہم

نواب احمد بخش خان کی وفات کے بعد نواب شمس الدین احمد خان نے تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو اپنا محتاج بنا لیا ۔اِسی لیے نواب شمس الدین احمد خان کو جائیداد سے بے دخل کرنے کے لیے ولیم فریزر(William Faraser)(۱۷۸۴ء۔۱۸۳۵ء) کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ پھر یہ افواہ کہ نواب شمس الدین احمد خان نے ولیم فریزر کو یہ کہا ہے کہ اگر وہ اُس کے بھائیوں کے ساتھ مقدمے میں اُس کی مدد کرے تو وہ اپنی بہن جہانگیرہ کی شادی اُس سے کر دے گا۔ ولیم فریزر کی طرف سے پھیلائی گئی اِس افواہ کی وجہ سے نواب شمس الدین احمد خان کو بے وجہ خفت اُٹھانا پڑی۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ولیم فریزر نے جائیداد کے تنازع میں نہ صرف اُس کے بھائیوں کی مدد کی، بل کہ بارہا اِس مقدمے کے ضمن میں نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف رپورٹیں لکھ کر کلکتہ روانہ کیں، مگر نواب شمس الدین احمد خان نے ولیم فریزر سے کسی قسم کا کوئی بدلہ نہ لیا۔ اِسی طرح وزیر خانم کے معاملے میں بھی ولیم فریزر نے شمس الدین احمد خان کی حد سے سوا مخالفت کی، مگر نواب شمس الدین احمد خان یہ تمام باتیں برداشت کر گیا ، لیکن جب اُس کی ہمشیر جہانگیرہ بیگم کا نام ولیم فریزر کی زبان پر آیا تو نواب شمس الدین احمد خان کے غصے کا حرارہ انتہا کی حدوں کو چھونے لگا اور وہ ولیم فریزر کو قتل کروا کر خود تختہ دار پر جھُول گیا۔

نواب شمس الدین احمد خان کی دو بیویاں تھیں، مگر وہ دونوں سے ناخوش تھا، تاہم اُسے وزیر خانم سے انتہا درجے کی محبت تھی۔ نواب شمس الدین احمد خان نے وزیر خانم کو "بہو خانم" کا خطاب دیا، یہی خطاب نواب شمس الدین احمد خان کے والد نواب احمد بخش خان نے اُس کی والدہ مدی کو دیا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان کا کردار تضادات کی گرد میں لتھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ مثال کے طور پر وہ نماز کی پابندی اور اپنی بیویوں کو حق مہر اسلامی شریعت کے مطابق ادا کرتا ہے، مگر وزیر اور چمپا سے زناشوئی کرتے ہوئے اُسے اسلام یاد نہیں آتا۔ نواب شمس الدین احمد خان نے اپنی زندگی میں وزیر خانم اور چمپا کو ہی اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا ، بل کہ:

> "اپنی مختصر مگر مصروف زندگی میں شمس الدین احمد نے بہت بدن دیکھے تھے۔ بازاری، خانگی، ہوس یا شوق یا احساس فرض کی ماری بیگمیں، لیکن یہاں تو عالم ہی دیگر تھا۔" (۱۱)

بلاشبہ نواب شمس الدین احمد خان ایک خوب رُو، پُر وجاہت، خوددار، اور رئیسانہ رکھ رکھاؤ سے آراستہ ایک ایسے نواب کا کردار ہے، جس کی طبیعت میں رعونت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ جملہ انتظامی امور سے مزین یہ کردار بہترین فیصلہ سازی اور خود اعتمادی کی صفات سے بھی بہ خوبی آراستہ تھا۔ مختصر یہ کہ نواب شمس الدین احمد کا کردار غیرت و حمیت، انسانیت و شرافت اور ہندوستانی تہذیب کی خاطر خواہ نمائندگی کرتا ہے۔(۱۲) اِس ناول کا ایک اور اہم کردار کریم خان عرف بھرمارو(۱۳) عرف گلِ سرخ، نواب شمس الدین احمد خان کا انتہائی معتمد علیہ اور خاص دوست، جو نواب شمس الدین احمد خان کے کہنے پر بغیر کسی حیل و حجت کے ولیم فریزر کو قتل کرنے کا بیڑہ اُٹھالیتا ہے۔ وہ شکار کھیلنے میں انتہائی طاق اور جنگل کے پیچ و خم سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ مصنف نے اِس کردار کے تعارف میں غلو سے کام لیتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اور بتایا ہے کہ کریم خان کئی طرح کے ہتھیاروں کو بہ خوبی چلانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا، بالخصوص وہ فنونِ سپہ گری، مسلح اور نہتی لڑائی و دفاع کے رموز سے خاص طور پر مزین تھا۔ وہ انتہائی چست و چالاک، ظریف الطبع، شائستہ کلام، وجیہ صورت، مضبوط سراپے کا مالک اور دائمی مجرد شخص تھا، کیوں کہ:

> ”وہ کہتا تھا کہ جنگل کی جھاڑیاں میری رانیاں ہیں اور جنگل کے چھتنار درخت میرے براتی ہیں۔ پھر مجھے کسی اور سے شادی کی کیا پڑی ہے۔“ (۱۴)

ولیم فریزر کے قتل میں ماخوذ ہو کر جب کریم خان جیل جاتا ہے تو وہاں اُسے انتہائی سخت اور غیر انسانی سزائیں دی گئیں، مگر اُس کے پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ قیاس کہتا ہے کہ ہو نہ ہو مشکی سوار کریم خان ہی تھا، جس نے ولیم فریزر کو قتل کیا۔ گویا کریم خان کا کردار ثنویت و دوہریت(Duelty) کا حامل ایک ایسا کردار ہے، جو قاری کے دل پر دیرپا تاثر چھوڑ کر پھانسی کے پھندے کو چوم لیتا ہے، مگر اپنے مالک کے خلاف ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لاتا۔ اِس کردار کا استقلالِ مزاج ہی دراصل اُس کی اصل پہچان ہے۔ اِس ضمن میں فیروز عالم رقم طراز ہیں:

> ”اِس ناول میں جہاں انگریزوں کی عیاریوں اور مکاریوں کو ظاہر کیا گیا ہے وہیں عوام میں اُن کے تئیں بڑھتی نفرت اور غم و غصے سے بھی روشناس کرایا گیا ہے۔ ولیم فریزر کے مبینہ قاتل کریم خان کی پھانسی کے بعد مسلمان، ہندو، جین اور سکھوں کا اُس کے لیے دعاے مغفرت کرنا اِس بات کا اشاریہ ہے کہ عوام انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور وہ ایسے جیالوں کو پسند

کرتے تھے، جو انگریزوں کے خلاف آواز بلند کریں اور جابر و ظالم افسران کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔" (۱۵)

اِسی طرح انیا میواتی کا کردار، جو نواب شمس الدین احمد خان کا گویا ہر کارۂ خاص تھا۔ جس چابک دستی سے وہ نواب شمس الدین احمد خان کا خط اپنی پگڑی میں چھپا کر لاتا ہے، قاری ناول میں اُس کی پہلی آمد کے ساتھ ہی اُس کی غیر معمولی چالاکی اور تیز طراری کا قائل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ولیم فریزر کے قتل کی خبر لے کر جس برق رفتاری کے ساتھ وہ فیروز پور جھرکہ نواب شمس الدین احمد خان کے پاس پہنچتا ہے، وہ بھی اُس کے شاطر و چالاک ہونے کی بین دلیل ہے۔ اِس کے علاوہ انیا میواتی کو فنِ جاسوسی، گویا لوگوں کا تعاقب کرنے میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ ولیم فریزر کے قتل کی اطلاع نواب شمس الدین احمد خان کو دینے کے بعد حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے وہ فوراً رُوپوش ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں پکڑے جانے پر وہ سب کچھ اُگل دیتا ہے اور سلطانی گواہ بن کر اپنی جان بچا لیتا ہے اور اپنے مالک نواب شمس الدین احمد خان اور اپنے دوست کریم خان بھر مارو کو تختۂ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔ اِس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کریم خان کا کردار وفاداری کی ایک بے مثل مثال ہے تو وہاں انیا میواتی اِس معیار پر مُطلق پورا نہیں اُترتا۔

ازاں بعد میرزا مغل بیگ خان کا کردار، جسے شمس الدین احمد خان کے مقدمے میں محض اِس بنا پر گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی کہ وہ اُس کا خسر تھا۔ چوں کہ وہ انگریزوں کی نظر میں پہلے ہی بے اعتماد اور غیر وفادار مشہور تھا، اِس لیے اُسے فوراً شاملِ تفتیش کر لیا گیا اور اُس وقت تک قید میں رکھا گیا، جب تک کہ کریم خان اور نواب شمس الدین احمد خان پر کم و بیش جرم ثابت نہیں ہو گیا۔ اِس کردار کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی رہائی اور نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری کے بعد مقدمے کی پیروی کرتا ہے اور وکیل کے ذریعے ہر ممکن اقدام اُٹھاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نواب شمس الدین احمد خان کو پھانسی سے بچانے میں ناکام رہا۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ پھانسی کے بعد شمس الدین احمد خان کی لاش کو بھی میرزا مغل بیگ خان نے ہی وصول کیا۔ اِس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ میرزا مغل بیگ خان کا کردار ایک انتہائی بُردبار اور تحمل مزاج شخص کا کردار ہے، جو نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ دامے، درمے، قدمے، سخنے گویا ہر طرح سے وفا کرتا ہے۔

پھر میرزا فتح اللہ بیگ خان کا کردار، جو نواب شمس الدین احمد خان کا رشتے کا بھائی تھا۔ اِن دونوں میں کسی وجہ سے پُرانی مخاصمت چلی آ رہی تھی، اِس لیے اِس پرخاش کو نکالنے کے لیے میرزا فتح اللہ بیگ خان نے ولیم

فریزر کے قتل پر جب بلا تحقیق یہ نعرہ لگایا کہ: "ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا۔"(۱۶) تو اِس پاداش میں اُسے گرفتار کر کے شاملِ تفتیش کر لیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے اپنی اِس حماقت کا بعد میں احساس ہوا۔ مختصر یہ کہ میرزا فتح اللہ بیگ خان ایک منتقم مزاج، کینہ پرور، زُود پشیماں اور کسی حد تک ایک ایسا احمق شخص تھا، جس میں حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

جب کہ میرزا اسفند یار بیگ نواب شمس الدین احمد خان کا خاص وکیل، جو ریاست ہائے فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے معاملات میں صاحبانِ انگریز کے دفاتر اور عدالتوں میں بہ غرضِ پیروی حاضر ہوا کرتا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان کے مقدمہ کے سلسلہ میں میرزا اسفند یار بیگ نے کئی طویل اور کٹھن سفر اور سرتوڑ کوششیں کیں، مگر اِس کے باوجود وہ کریم خان اور نواب شمس الدین احمد خان کو پھانسی کی سزا سے نہ بچا سکا۔ گو کہ نواب شمس الدین احمد خان کے کیس کے حوالے سے وہ ایک ناکام وکیل ٹھہرا، مگر یہ ناکامی اُس کی ترقی و اقبال مندی کے راستے میں حارج نہ ہوئی، کیوں کہ کچھ عرصہ بعد وہ الور میں "نائب دیوان" اور پھر بعد میں "دیوان" ایسے اہم اور بلند تر عہدوں پر متمکن ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان کے کیس میں ناکامی کا اُسے شدید صدمہ ہوا، مگر اُس کی کوششیں لاجواب اور ناقابلِ فراموش ہیں، تاہم اِس سبکی کی وجہ سے بعد ازاں اُس کا طرزِ حیات تبدیل ہو کر رہ گیا:

> "میرزا اسفند یار بیگ اپنی ناکامی پر اِس قدر شرمندہ و محزوں ہوا کہ اُس نے دستار باندھنی چھوڑ دی اور تا عمر محض ایک مختصر دوپٹہ سر پر باندھتا رہا اور عوام میں "میرزا پھینٹے باز" کہلایا۔"(۱۷)

اِس تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا اسفند یار بیگ کا کردار ایک اَن تھک، محنتی، جفاکش، مخلص، باوفا اور بہترین صلاح کار وکیل کا کردار ہے، جو اپنے مؤکل کو حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر بہترین مشورہ دیتا ہے۔ اِسی طرح میرزا بجھو اور دیوان عبداللہ خان کے غائب کردار، جن کا تذکرہ مصنف نے محض تین چار سطروں میں ایک ساتھ کیا ہے۔ مذکورہ دونوں کردار نواب شمس الدین احمد خان کے وکیل میرزا اسفند یار بیگ کی غیر موجودگی میں معمول کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے نائب وکیل کی حیثیت سے دہلی کی عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ اِس پر طُرّہ یہ کہ اِن دونوں کو عدالتی ایوان میں مکمل وکیل کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی، کیوں کہ یہ

دونوں کسی گواہ سے جرح تک کرنے کے بھی مجاز نہ تھے۔ عدالتی کارروائی میں عملی شرکت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ دونوں کردار کٹھ پتلی یا شطرنج کے مہروں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

نواب شمس الدین احمد خان جب ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں ماخوذ ہو کر دہلی آیا تو عین اِس موقع پر اُجاگر سنگھ نامی ایک شخص، جو نواب شمس الدین احمد خان کے والد نواب احمد بخش خان کا خاص ہرکارہ ہوا کرتا تھا، مگر نواب موصوف کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے وظیفہ حسنِ خدمت لے کر وہ اپنے وطن واپس چلا گیا تھا، مگر اب نواب شمس الدین احمد خان کے ماخوذ ہونے کی خبر سن کر دوڑا چلا آیا۔ اُجاگر سنگھ نواب شمس الدین احمد خان کو انتہائی خلوص کے ساتھ پیش کش کرتا ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے وطن چلیں، میں آپ کی مکمل حفاظت کروں گا، مگر نواب شمس الدین احمد خان نے اُس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ مذکورہ حالات و واقعات کی روشنی میں برملا کہا جا سکتا ہے کہ اُجاگر سنگھ کا کردار ایک احسان مند، بہادر، باوفا اور پُر خلوص ملازم کا کردار ہے، جو سلسلۂ ملازمت سے دائمی رخصت لینے کے باوجود وہ اپنے مالک کے بیٹے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اُس کی زندگی بچانے کے لیے آجاتا ہے۔

بعینہٖ نواب شمس الدین احمد خان کے والد نواب احمد بخش خان کا کردار بھی ایک ایسے نواب کا کردار ہے، جس کی عادات و مشغولیات اور معمولات و مصروفیات روایتی انداز کے حامل نوابوں کی سی ہیں، یعنی شکار کھیلنا، بڑی بڑی حویلیاں خریدنا، ایک سے زائد شادیاں کرنا، غربا و مساکین کا خیال رکھنا اور اپنی اولاد کی خاطر ہر ممکن وسائل کی یافت کرنا، یہ سب مشاغل نواب احمد بخش خان کے بھی تھے۔ وہ دوستوں کے دوست اور ایک مجلسی انسان تھے، بالخصوص اُن کے جرنیل اختر لونی(Sir David Ochterlony)(۱۷۵۸ء۔۱۸۲۵ء)، جیمس اسکنر (James Skinner) (۱۷۷۸ء۔۱۸۴۱ء)، چارلس مٹکاف(Charles Metcalfe) (۱۷۸۵ء۔۱۸۴۶ء)اور ولیم فریزر(William Fraser) (۱۷۸۴ء۔۱۸۳۵ء)سے بڑے اچھے مراسم تھے، جنھیں بعد میں نواب شمس الدین احمد خان نے اپنی ضد اور حماقتوں کی وجہ سے اپنا دشمن بنالیا۔ اساسی طور پر نواب احمد بخش خان کا کردار ایک انصاف پسند، انسان شناس، انتہائی سنجیدہ فکر اور متحمل مزاج انسان کا کردار ہے۔

بعد ازاں نواب شمس الدین احمد خان کے چھوٹے بھائی نواب امین الدین احمد خان(پ:۱۸۱۴ء)کا کردار آتا ہے، جو حسینہ بیگم جان کے بطن سے پیدا ہوا۔ اِس کا نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ جائیداد کے ضمن میں تنازع چل رہا تھا، کیوں کہ نواب شمس الدین احمد خان نے نواب احمد بخش خان کی وصیت کو نظر انداز

کرتے ہوئے تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اپنی جائیداد کے حصول کے لیے نواب امین الدین احمد خان نے خود تو کوئی ٹھوس قدم نہیں اُٹھایا، مگر نواب شمس الدین احمد خان کے مخالفین بالخصوص ولیم فریزر اور اُس کے ہم خیال انگریزوں نے اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر نواب شمس الدین احمد خان کو جائیداد سے محروم کر دیا تو نواب امین الدین احمد خان کو اُس کا حق مل گیا، تاہم اگر جائیداد کی بازیابی کے ضمن میں نواب امین الدین احمد خان کی ذاتی کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ہاں کارروائی کی حد تک ہی سہی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نواب امین الدین احمد خان کہنے کو تو والیِ لوہارو تھا، مگر عملی طور وہ ایک غیر متحرک اور سست الوجود شخص تھا، جو اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج و دستِ نگر رہا، مگر جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ حساب کتاب کے لیے فوراً مستعد و فعّال ہو جاتا ہے۔

مولوی شیخ محمد نظیر رفاعی مجدّدی ایک صاحبِ حیثیت، تعلیم یافتہ، مذہب پسند اور ایک نیک دل انسان کا کردار ہے، جس کا آبائی تعلق تو گجرات سے تھا، مگر اُس نے دہلی کو اپنا مستقل ٹھکانہ کر لیا تھا۔ اُس کی شادی انوری خانم عرف بڑی بیگم سے ہوئی، جس کے بطن سے کئی برس بعد فاطمہ نامی لڑکی کی پیدائش ہوئی۔ فاطمہ کو مولوی صاحب نے بڑے ناز و نعم سے پالا اور بعد میں اُس کی شادی میرزا داغ دہلوی سے کر دی۔ مولوی شیخ محمد نظیر رفاعی مجدّدی کا کردار ایک شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر، متقی، پرہیز گار اور ایک روایتی مولوی کا کردار ہے، جو دین و مذہب کی راہ سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ فاروقی نے اِس کردار کو تہذیب و شائستگی کا ایک اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔

بعینہٖ قلعہ معلّٰی کے شاہی طبیب احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان (۹۸-۱۷۹۷ء-۱۸۷۳ء) کا کردار بلا مبالغہ ایک ہشت پہلو شخصیت کا حامل کردار ہے۔ ہندو مسلمان سبھی اُن سے عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خان کی عزت و تکریم اور مقام و مرتبہ کا اندازہ اِس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ میرزا فخرو نے وزیر خانم کو اپنے عقد میں لینے کی بات ظلِ سبحانی تک پہنچانے کے لیے حکیم احسن اللہ خان کا ہی انتخاب کیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ سلامت اُن کی بہت قدر کرتے ہیں اور اُن کی بات کو ٹالنا ظلِ سبحانی کے لیے بھی ناممکن ہو گا۔ اُنھیں قلعے کے نجی معاملات میں بھی صلاح و مشورہ لے لیے مدعو کیا جاتا تھا:

> ''لیکن حقیقت یہ ہے کہ کارہائے سلطنت میں وہ جتنا دخل رکھتے تھے، اتنا ولی عہد اوّل یا وزیر اعظم کو بھی حاصل نہ تھا۔ کچھ اِس بنا پر کہ وہ بادشاہ کے معالجِ خاص تھے، اور کچھ اِس وجہ سے

کہ اُن کی مدبرانہ صفات اور باوزن بات کے باعث بادشاہ کے یہاں اُن کی ہر رائے قبول ہوتی تھی۔" (۱۸)

ولیم فریزر سے گفتگو کے دوران حکیم احسن اللہ خان کا رویہ مؤدبانہ ہونے کے بجائے معاندانہ اور برابری کے احساس پر مبنی ہوتا تھا۔ کسی کا آلہ کار بننا اُسے منظور نہ تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھا، جس کے دل و دماغ پر انگریزوں کے خوف کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ حکیم احسن اللہ خان ایک ایسے شخص کا کردار ہے، جو ایک وسیع النظر، حلیم وبردبار، منکسر المزاج، عالی خیال، حد درجہ متین، عاقبت اندیش، عقل کا مجسمہ اور ہند اسلامی تہذیب کا عملی نمونہ تھا۔ ازاں بعد محمد امیر اللہ یا امیر اللہ کا کردار اپنے اصل نام اور سوفیہ کا پہلا یا دوسرا شوہر ہونے کا محض شک پیدا کرتا ہے اور مصنف کی زبانی یہ سوال کہ اُس کا اصل نام کیا تھا؟ اور وہ سوفیہ کا پہلا شوہر تھا یا دوسرا؟ فی الاصل یہ کردار شک و شبہ، ظن و تخمین، سوچ بچار اور غور و فکر کے پاتال میں قاری کو دھکیل کر خود سر تاپا استفسار یہ صورت میں مجسّم ہو کر ناول سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

ازاں بعد جونتارام ایسے منفی سوچ کے حامل شخص کا کردار آتا ہے، جو سوائی راجا جے سنگھ (۱٦۸۸ء۔۱۷٤۳ء) کا مختار عام ہونے کے باوجود عوام میں سخت ناپسندیدہ شخص تھا۔ اُس کے نجی و تجارتی مراسم اجمیر، مارواڑ، الور اور تمام رجواڑوں سے تھے۔ اِس طرح اگر جونتارام کو ریجنٹی مل جاتی تو وہ ایک متحدہ محاذ قائم کر سکتا تھا، جو انگریزوں کے مفاد کے سخت خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مارسٹن بلیک ایسا بااختیار فرنگی افسر بھی اُس سے ڈرتا تھا۔ سوائی راجا جے سنگھ کی بیماری کے دنوں میں وہ محل کی ناکہ بندی کرنے کے بعد انگریز ڈاکٹر اور دیگر عملے کو اپنا بندی بنالیتا ہے۔ علاوہ ازیں اُس کی معزولی کا پروانہ لانے والوں کو بھی گرفتار کر لیتا ہے، بل کہ پیش آمدہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ اجمیر سے دیسی فوج بھی طلب کر لیتا ہے۔ جونتارام انتہائی شاطر، تیز طرار، سازشی ذہن کا مالک، فوری فیصلے لینے والے ایک بے باک شخص کا کردار ہے، جسے اپنی طاقت اور عقل پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مان تھا۔ جونتارام ایک باکمال منصوبہ ساز تو ضرور تھا، مگر اُس نے انگریز ڈاکٹر اور اُس کے عملے کو قیدی بنا کر جو غلطی کی، اُسے اِس غلطی کا خمیازہ جلد بھگتنا پڑا، جب کہ دوسری غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ وہ ہر چیز خصوصاً انگریزوں کو بکاؤ مال سمجھتا تھا اور یہی غلطی اُس کی موت کا سبب بنی۔

اِسی طرح مارسٹن بلیک کا خانساماں چاند خان اِس ناول کا ایک ذیلی (Additional Characters) کردار ہے، جو قاری کی توجہ اپنی جانب منعطف کرواتا ہے۔ چاند خان ہی دراصل وہ شخص تھا، جس نے سب سے پہلے

مارسٹن بلیک کو سوائی راجاجے سنگھ کی بیماری اور جوتنا رام کے گھناؤنے عزائم سے آگاہ کیا۔ چاند خان ایک وفادار، باہمت، حفظِ مراتب کا خیال رکھنے والا اور باسلیقہ ملازم کا کردار ہے۔ علاوہ ازیں زیرِ بحث ناول میں بعض جامد اور بے لچک یا دوسرے لفظوں میں مثالی (Stereotype) کردار بھی کہانی کا حصّہ بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر شدید بیمار سوائی راجاجے سنگھ، کم سن مہاراجارام سنگھ، مہاداجی سندھیا، مہاداجی سندھیا ثانی اور پیشوا ایسے کردار، جو عمومی طور پر ایک ہی دنیا سے تعلق رکھنے والے ٹائپ اور مثالی قسم کے کردار کہے جاسکتے ہیں، جن کی شخصیت کی خصوصیات کم و بیش ایک سی ہیں۔ اِسی طرح صیغۂ خزانہ سے تعلق رکھنے والا سیٹھ راول رام، جو سوائی راجاجے سنگھ کا انتہائی معتمد علیہ تھا، وہ سوائی راجاجے سنگھ کی بیماری کے ایّام میں اُس کے بارے میں پل پل کی خبر رکھتا تھا۔ چوں کہ اُس کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف تھا، اِس لیے انگریزوں کے نزدیک سوائی راجاجے سنگھ کی وفات کے بعد اُن کے مفاد میں بہترین اتالیق سیٹھ راول رام ہی ہو سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جوتنارام اُسے سوائی راجاجے سنگھ تک رسائی حاصل کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ سیٹھ راول رام کا کردار بھی ایک مثالی اور ٹائپ قسم کا کردار ہے۔

علاوہ ازیں جوتشی کا کردار بھی ایک بے نام، روایتی اور ٹائپ قسم کا مثالی کردار ہے، جو نواب شمس الدین احمد خان کو ظن و تخمین لگا کر دو مہینے تک دہلی شہر نہ چھوڑنے کی صلاح دیتا ہے، جس پر نواب شمس الدین احمد خان کان نہیں دھرتا۔ ازاں بعد وہ نواب شمس الدین احمد خان کی خواہش پر ستاروں کے علم کے مطابق حساب کتاب لگا کر اُسے کم سے کم مخالفانہ وقت کا تعین کرکے بتاتا ہے کہ اُسے دہلی سے کب روانہ ہونا چاہیے۔ یہ کردار مخلوط ہند اسلامی تہذیب کی یاد دلاتا ہے۔

اِس ناول کا ایک اوراہم کردار کشن گڑھ کے مہاراول گجندر پتی سنگھ کا ہے۔ مہاراول گجندر پتی سنگھ کا بنیادی تعلق تو بوندی راج کے زمین داروں سے تھا، مگر کشن گڑھ راج سے خانہ دامادی ہونے کی وجہ سے وہ کشن گڑھ ہی میں مستقل سکونت پذیر تھا۔ لوگوں کی مدد امداد کرنا اور انعام وغیرہ دینا مہاراول گجندر پتی سنگھ کا معمول تھا۔ اہلِ کشن گڑھ پر اُس کا رعب و دبدبہ اِس قدر زیادہ تھا کہ گاؤں میں اُس کی آمد پر لوگ اپنے گھر، گلیوں، بازاروں کی صفائی ستھرائی اور رنگ وروغن تک کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ مہاراول روایتی انداز کا حامل ایک ایسا غصیلا اور سخت مزاج انسان تھا، جو مصنوعی غیرت کے نام پر اپنی پندرہ برس کی جوان بیٹی کا خون بہاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتا کہ وہ کیا ظلم کرنے جارہا ہے۔ یہ شخص بے حد ظالم اور اپنی اندھی طاقت کے نشے میں اِس قدر چور تھا کہ اپنی بیٹی اور میاں چیترا کی غلطی (اگر اُنھوں نے کوئی غلطی کی بھی تھی تو) کی سزا پورے گاؤں کو دیتا

ہے اور حقائق کو جانے بغیر اپنی بیٹی کو تہہِ تیغ کر دیتا ہے۔ مہاراول کا کردار ہمارے دیہی سماج کا ایک ایسا جیتا جاگتا کردار ہے، جس کی غیرت محض ماں، بہن یا بیٹی کے رشتے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح من موہنی کے باپ مہاراول کا ایک بے نام سپاہی ، جو میاں چیترے کے گھر میں بنی ٹھنی کی تصویر کے متعلق بحث میں حصہ لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے کہ یہ تصویر اصلی ہے۔ اِس کردار کی اصلیت اِس کے ایک جملے سے ہی قاری پر ظاہر ہو جاتی ہے:

> "نہیں۔" مہاراول کا ایک سپاہی پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے اور سرگوشی کے لہجے میں کہا، "اور پھر اُس نے جلدی سے کان اور منھ کو سختی سے بند کر لیا۔" (۱۹)

مہاراول کا یہ سپاہی مختصر مدت کے لیے اِس ناول میں آتا ہے اور اپنی فطری بزدلی، کم زوری اور غلامانہ ذہنیت کا دبے لفظوں میں اظہار کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کردار انسانی جبر کا شکار طبقے کی عکاسی کرتا ہے، جو ہمیشہ خوف کے سائے تلے اپنے آدھے سچ کی دنیا میں زندگی گزارتا ہے۔

اِس ناول کا ایک اور اہم ضمنی کردار گانجا پینے والے شخص کا ہے۔ بے پناہ غصیلی طبیعت کا مالک یہ کردار انتہائی پُر اسرار انداز میں جب اچانک اِس ناول میں قدم رکھتا ہے، تو اُس وقت اُس نے اپنا منہ لپیٹ رکھا تھا۔ یہی گانجا پینے والا شخص، جو میاں چیترے کی بنائی ہوئی تصویر کو ایک ہی نظر میں دیکھ کر نہ صرف گاؤں والوں کو اُس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے، بل کہ اُس تصویر کو وہاں سے ہٹانے کا مشورہ بھی دیتا ہے، مزید وہ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ یہ بنی ٹھنی نہیں، بل کہ یہ مہاراول کی بیٹی من موہنی ہے۔ گانجا پینے والے شخص کا یہ کردار مستقبل کے حالات کو بھانپنے کی بھی خوب صلاحیت رکھتا تھا، جو گاؤں والوں کو پیش آمدہ بُرے حالات کی خبر دیتے ہوئے کہتا ہے :

> "یہ گاؤں لٹے گا۔ یہ گاؤں تباہ ہو گا، اُجڑے گا۔ کیا تم دھمک اونچی سانڈنی سواروں اور پہاڑیوں جیسے بھاری صبار فتاروں کے قدموں کی نہیں سن رہے ہو؟ چلو۔ سب ختم ہو گیا۔ میاں نے اِس گاؤں کو سولی پر چڑھوا دیا۔ تقدیریں تمھاری اپنے تھان پر سے کچل گئیں۔"(۲۰)

زیرِ گفتگو ناول کا ایک اور اہم کردار آغا مرزا تراب علی کا ہے، جسے اِس ناول میں ایک بے پناہ محبت کرنے والے شوہر کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بموجب وزیر خانم سے شادی کرنے کے بعد

اُسے وہ تمام خوشیاں دینے کی کوشش کرتا ہے، جو اُس کے بس میں تھیں اور حقیقی معنوں میں وزیر خانم اُس کے ساتھ خوش بھی تھی۔ آغا مرزا تراب علی نے آغاز سے ہی وزیر خانم سے رشتہ مناکحت قائم کیا اور اُس کے ساتھ کم و بیش دو ڈھائی برس بتائے۔ وہ نہ صرف وزیر خانم کی شاعری کا احیا کرتا ہے، بل کہ اِس ضمن میں اُس کی خوب حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ آغا مرزا تراب علی کے کردار میں ایک نوابی رکھ رکھاؤ اور سبھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُس کا کردار اندرونِ خانہ تو ایک پیار کرنے والے شوہر کا نظر آتا ہے، مگر جب وہ کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلتا ہے تو اُس کی شخصیت کی کئی پرتیں کھل کر قاری کے سامنے آتی ہیں۔ مقدم سطح پر تو اِس کردار میں گردشِ زمانہ اور انسان شناسی کی صلاحیت قدرے کم دکھائی دیتی ہے۔ ثانیاً اِس کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلا کا ضدی اور اپنی من مرضی کرنے والا ایک ایسا انسان ہے، جو بات بات پر ہٹ اور تکرار کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اِسی طرح منیر خان ایک اخلاق باختہ، مگر جہاں دیدہ اور تجربہ کار سیئس کا کردار ہے، جو میر زا تراب علی سے وابستہ خدمت تھا۔ منیر خان ایک زود پشیماں اور آسانی سے فریب میں آجانے والا ایک ایسا کردار ہے، جو اپنے پرانے محسن کو دھوکا دینے سے بھی باز نہیں آتا۔ چوں کہ ایک عرصے سے وہ میر زا تراب علی کا انتہائی معتمد علیہ رہا، اِس لیے اُسے نوکری سے برخاست کرنے کے بعد میر زا تراب علی کو بھی بہت افسوس ہوا، جب کہ دوسری جانب منیر خان نوکری سے الگ ہو جانے کے بعد رام پور اپنے گھر جانے کے بجائے ایک بازاری عورت کے گھر میں اپنا وقت گزارنے لگتا ہے اور بعد میں میر زا تراب علی کی تلاش کے دوران بھی وہ ایک دوسری طوائف کے گھر میں اپنا ٹھکانہ کرتا ہے۔ منیر خان ایک عجیب الفطرت اور پُر اسرار شخص کا کردار ہے، جو خود تو اپنے مالک کو ٹھگوں سے بچنے کی بار بار تلقین کرتا ہے، مگر خود صادق نامی ٹھگ کے ہاتھوں بہ آسانی دھوکا کھا جاتا ہے۔ اُس کے کردار کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فیصلے ہمیشہ عجلت میں کرنے کا عادی تھا، یعنی کبھی وہ میر زا تراب علی سے کہتا ہے کہ مجھے گولی مار دو میں اِس شرمندگی کے ساتھ جینا نہیں چاہتا، کبھی اعلان کرتا ہے کہ میں خود اپنی جان لے لوں گا یا پہاڑوں میں جا کر بن باسی ہو جاؤں گا اور جب اپنے مالک کی تلاش میں مجبوراً نکلتا بھی ہے تو تلاش کے دوران راہِ فرار کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ مجبوری، خوف اور دھڑکا ہمہ وقت اِس کردار کے ساتھ لپٹا رہتا ہے۔

بعینہٖ صادق خان زیرِ بحث ناول میں ایک روایتی ٹھگ کا کردار ہے، جو منیر خان کو بہ آسانی شیشے میں اُتارنے کے بعد میر زا تراب علی خان کو بھی جُل دینے کی کوشش کرتا ہے، مگر میر زا تراب علی کی بیدار ذہنی کی بہ دولت اُس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ صادق خان کا کردار ایک کچے اور کسی قدر بزدل شخص کا کردار ہے، جس میں چتر

چالاکی اور غلط بیانی کی صلاحیت، جو اِس قماش کے ٹھگوں کا طرّہ امتیاز ہوا کرتی ہے، نہیں پائی جاتی ،بل کہ حالات کی ذرا سی سختی برداشت کرنے کا حوصلہ بھی اُس میں ناپید ہے، جب کہ اُس کی ناکام منصوبہ بندی بھی اُس کے خام ہونے کی غمازی کرتی ہے۔

اِس ناول کا ایک اور اہم کردار حبیبہ اور جمیلہ کے سوتیلے باپ، یعنی ''بابو'' کا ہے۔ اُس کا حلیہ اور اُس کی رکاکت آمیز گفتگو ہی دراصل اُس کی کردار کشائی کا منبع و سرچشمہ معلوم ہوتی ہے:

> ''ایک ادھیڑ سے کچھ زیادہ عمر کا شخص، دھوتی اور سوتی بنڈی میں ملبوس، گلے میں سیاہ سیلی اور تعویز، ہاتھ میں لمبا راجپوتی بلم لئے بڑھا آرہا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں لکڑ بگھے کی یاد دلاتی تھیں۔'' (۲۱)

بابو ایک لالچی، بد زبان اور اخلاق باختہ ذہنیت رکھنے والے ایک ایسے شخص کا کردار ہے، جو اپنی سوتیلی بیٹیوں حبیبہ اور جمیلہ کو جے پور کے بازارِ حسن میں مال زادیوں کی طرح فروخت کرنا چاہتا تھا۔ یہ کردار معاشرے کے ناسور کرداروں کی ذیل میں آتا ہے، جو ذاتی مفاد کے لیے انسانی گراوٹ کی کسی بھی سطح پر گر سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر روپے کی چمک بہت جلد ایسے لوگوں کی نام نہاد غیرت کی گرمی کو فوراً ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ نشو و نما کی صفت سے عاری اِس کردار میں ارتقائی مدارج یا نمو پذیری کا عمل سراسر مفقود دکھائی دیتا ہے۔

بعینہٖ پنڈت نند کشور کا کردار ایک باکمال ستارہ شناس، رمال اور شانہ بیں شخص کا کردار ہے۔ پنڈت نند کشور ایک کٹر مذہبی ہندو اور ایک خود دار شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے، جسے کسی پر بوجھ بننا یا کسی کا احسان لینا قطعاً ناپسند تھا، یہاں تک کہ اپنی اولاد کا بھی نہیں۔ پنڈت نند کشور دراصل ایک بے لوث اور قانع شخص کا کردار ہے، جو حرص و ہوس اور لالچ سے کوسوں دُور تھا:

> ''وزیر خانم نے جلدی سے ایک تھیلی روپیوں کی، ایک بڑا ریشمی رومال، موگرے کے جونپوری عطر پھر ایک شیشی اور عمامے کے لئے بلبل چشم کا ایک تھان پیش کیا کہ یہ حقیر نذرانہ کنیز کی طرف سے قبول ہو۔ لیکن پنڈت نند کشور نے کچھ بھی لینے سے انکار کیا۔'' (۲۲)

پنڈت نند کشور نہ صرف چھوٹی بیگم کی مدد کرتا ہے، بل کہ ایک باپ کی طرح اُس کے سر پر دستِ شفقت رکھتا ہے۔ وہ ایک خوش آواز، بااعتماد، بارعب اور کسی حد تک جادوئی تاثیر رکھنے والے ایک ایسے پُر اسرار

شخص کا کردار ہے، جو ہندو ہونے کے باوجود "دیوانِ حافظ" سے فال نکالتا ہے۔ اِس موقع پر یہ کردار بھی مخلوط معاشرے کی مخلوط تہذیب و ثقافت کا عکاس و ترجمان دکھائی دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اِس کردار کے ذریعے اُس زمانے کے حالات کا عمومی نقشہ بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ازاں بعد ایک غائب کردار کی حیثیت سے حکیم محمود کا کردار آتا ہے، جو سرسری سے ذکر کے ساتھ ہی اِس ناول کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے، جب کہ اِس کے مقابلے میں اُس کے شاگرد حکیم بھورے خان کا کردار، جو حاضر بھی ہے اور قدرے عملی انداز کا حامل بھی ۔ حکیم بھورے خان اپنے اُستاد حکیم محمود کی غیر موجودگی میں مطب خانے کو بہ حسن و خوبی چلانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنے اُستاد کی طرح اپنے کام سے لگاؤ، خلوص اور مہارت رکھنے کی بہ دولت بیماری کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت بھی اُس میں بدرجۂ غایت پائی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا "کئی چاند تھے سرِ آسماں" کے مرد کرداروں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد عالمی ادب پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف النوع عادات کے حامل افراد کو اپنی تخلیقات میں کام یابی سے کرداروں کی صورت میں پیش کرنے میں ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) (۱۵۴۶ء۔۱۶۱۶ء) اور ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) (۱۸۲۸ء۔۱۹۱۰ء) نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، جب کہ دیگر تخلیق کاروں نے اپنے چھوٹے چھوٹے دائروں اور محدودات کے اندر رہ کر ہی کردار تخلیق کیے ہیں۔ نتیجہ معلوم شمس الرحمن فاروقی نے بھی اِس ناول کی تخلیق میں اِسی روایتی اور مستعمل تکنیک سے مدد لی ہے ۔ مزید یہ کہ اُنھوں نے اپنی دست رس اور حدود سے باہر نکل کر کرداروں کو اِس ناول کا حصہ نہیں بنایا۔ فاروقی نے مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ذیلی یا ضمنی، اُکھرے، مرکب، محدود یا عارضی، باغی، فرنگی، مثالی اور پیچیدہ، گویا ہر طرح کے کردار پیش کیے ہیں، لیکن ایک بات صاف ہے کہ اُنھوں نے اِس ناول میں غیر ضروری کردار تخلیق نہیں کیے۔ کہہ سکتے ہیں کہ کرداروں کی بھیڑ میں اِس ناول میں آنے والا ہر کردار اپنے ہونے کا منطقی جواز فراہم کرتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اِس ناول میں کرداروں کے حوالے سے تنوّع پایا جاتا ہے۔ اِس ناول کے بعض کردار تو ذرا سی دیر کو ہمارے سامنے آتے ہیں اور جلد ہی رُوپوش ہو جاتے ہیں، مگر کچھ کردار پورے ناول پر پھیلے ہوئے ہیں، اِس لیے اُن کرداروں کی فطرت، سرشت، خصائل کا صحیح اندازہ ناول پڑھنے کے بعد غور و فکر کی مدد سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح اِس ناول کے بعض کردار فوری طور پر سمجھ میں نہیں آتے، بل کہ بہ تدریج اُن کی شخصیت کی پرتیں قاری پر وا ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ میاں مخصوص اللہ اور قالین باف بزرگ کے کردار اِسی ذیل

میں آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اِس ناول کے تمام کردار آپس میں مربوط ہی نہیں، بل کہ ایک دوسرے پر اثرانداز بھی ہوتے ہیں ۔ بلاشبہ اِس ناول کے جملہ کردار اپنی نشست اور مقام پر پوری طرح جذب و پیوست ہیں۔ مختصر یہ کہ زیرِ مطالعہ ناول روکھے، پھیکے، سطحی، یک رُخے، دل چسپی سے خالی اور غیر حقیقی کرداروں سے خالی ہے اور اِسی امر میں اِس ناول کی کام یابی کا راز پنہاں ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۱ء، ص۵۶
۲۔ ایضاً، ص۶۹
۳۔ ایضاً، ص۵۸،۵۹
۴۔ ایضاً، ص۶۹
۵۔ ایضاً، ص۱۳۰
۶۔ ایضاً، ص۷۷
۷۔ ایضاً، ص۱۳
۸۔ ایضاً، ص۱۵
۹۔ ایضاً، ص۱۴
۱۰۔ ایضاً، ص۲۳۴
۱۱۔ ایضاً، ص۳۳۷
۱۲۔ رشید اشرف خان، ڈاکٹر، کئی چاند تھے سرِ آسماں۔ ایک تجزیاتی مطالعہ، دہلی: براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص۱۶۴
۱۳۔ "بھرمارو" انگریزوں کے دور کی ایک بندوق کا نام تھا، جس میں بارود کو کاغذ میں گولی کی شکل دے کر نالی کی طرف سے بھرا جاتا تھا، لیکن اِس ناول میں فاروقی نے "بھرمارو" کا لفظ کریم خان کی عرفیت کے طور پر استعمال کیا ہے، جب کہ تمکین کاظمی نے اُس کا نام کریم خان عرف بھرمارو کے بجائے "کریم خان عرف بھامارو" لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:
داغ، میرزا نواب خان دہلوی، مثنوی فریادِ داغ، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۵۷ء، ص۷
۱۴۔ ایضاً، ص۴۴۵
۱۵۔ فیروز عالم، "اُردو ناول کی تاریخ کا سنگ میل"، مشمولہ خدا لگتی، (مرتبین) لئیق صلاح، ارشاد حیدر، حیدر آباد: الانصار پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء، ص۱۸۱
۱۶۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص۴۵۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۱۴

۱۸۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۷۰۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۲، ۶۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۸۷